تیسرا سرسید یادگاری خطبہ

# مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست

## کل اور آج

پروفیسر مشیر الحق
وائس چانسلر
کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی



تیسرا سرسید یادگاری خطبہ
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست
کل اور آج
پروفیسر مشیر الحق
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

زیر اہتمام
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
دہلی
۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۸ء

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار جولائی ۱۹۸۹ء　تعداد 500　قیمت: =/8

لبرٹی آرٹ پریس، پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

# پیش لفظ

پروفیسر مشیر الحق کے اس عالمانہ لیکچر کا عنوان "مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست — کل اور آج" اس لیے بھی بڑی معنویت کا حامل ہے کہ یہ سرسید یادگاری لیکچر کے سلسلے کا خطبہ ہے۔ انسانوں کی کسی جماعت کے "حال" کا کوئی وسیع اور معتبر مطالعہ اس کے ماضی کو نظر انداز کرکے نہیں کیا جا سکتا۔ مشیر صاحب نے غالباً اسی حقیقت کے پیش نظر ہندستانی مسلم سیاست کے رجحانات کو ماضی کے حوالوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مطالعے کا یہ انداز علمی و تحقیقی طرز کہلاتا ہے۔

عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کی "سیاست" مذہب سے غیر متعلق نہ تھی۔ اگرچہ سلاطین دہلی اور ان کے جانشین مغل بادشاہوں نے عام طور پر شریعت کے نفاذ کو ضروری نہیں خیال کیا لیکن عام مسلمانوں اور عملی طور پر مذہبی طبقے کو یہ اطمینان تھا کہ ان کا حکمران مسلمان ہے اور مسلم معاشرے میں شریعت کے سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کا عمل جاری ہے۔ بھلے ہی سیاست اور نظام حکومت کا شریعت سے کوئی گہرا تعلق نہ ہو۔ لیکن مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد جب سلطنت مغلیہ انحطاط اور پھر انتشار کی زد میں آگئی تو حقیقت بھی سامنے آئی کہ مسلم معاشرے کو سیاسی طور پر جو ایک استحکام حاصل تھا، وہ ایک مضبوط مرکزی حکومت اور بالواسطہ اس کی سرپرستی کا رہین منت تھا۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی اور بدلے ہوئے حالات میں ہندستان میں مسلم معاشرہ اور اس کے تشخص کو انتشار سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری، بغیر کسی حکومتی سہارے کے، خود مسلمانوں کی تھی۔ اس حقیقت کا احساس یوں تو حکمراں طبقے کے ایک اہم حصے یعنی طبقہ علماء کی کئی نسلوں پر ہوا ہوگا لیکن اس احساس کی گرمی اور شدت ہمیں شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کی شخصیت اور ان کی علمی و سماجی سرگرمیوں میں نمایاں طور سے ملتی ہے۔ ان کے بعد یہ احساس تقریباً اسی شدت سے ہمیں ان کے صاحبزادوں، ان کے گھرانے کے دیگر افراد اور ان بزرگوں سے علمی و تعلیمی و روحانی نسبت رکھنے والے اشخاص میں ملتا ہے جن کی تعداد سید احمد شہیدؒ کی قیادت میں لڑی جانے والی جنگ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) تک خاصی بڑی ہو گئی تھی اور جن کا اثر ملک کے دور دراز علاقوں میں بھی محسوس کیا جا رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی زندگی میں عہد جدید کے بانی سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) بھی اسی ولی اللہی مکتب خیال کے متاثرین اور وارث تحریکوں میں تھے۔

مشیر صاحب نے سرسید کی قائدانہ سرگرمیوں کا تجزیہ مختصر طور پر ہی سہی، لیکن بڑی ژرف نگاہی سے کیا ہے۔ سرسید کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی سیاست مذہب سے بیگانہ نہ تھی۔ ان کی سیاست انگریز دوستی کے علاوہ مسلمانوں کی مذہبی، فکری اور معاشرتی اصلاح میں تھی، لیکن یہ کہ ان کے یہاں آخرالذکر کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اور اسی سبب کہ ان کے

مذہبی وتہذیبی افکار معتبر نہیں قرار پائے اور عہد وسطی کی راسخ العقیدگی ہی جس کے ترجمان علما تھے، مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا امتیازی وصف رہی۔ اس طرح سرسید کی سیاست ایک عرصے تک افادیت لیے رہی لیکن اس کے فائدے وقتی اور جزوی طور پر ظاہر ہوئے لیکن زندگی کے اہم فیصلے کے وقت وہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مضر ہی ثابت ہوئی۔

سرسید کے بعد آزادی اور تقسیم سے پہلے ہندوستانی مسلم سیاست، جیسا کہ مشیر صاحب نے بڑی خوبی سے بیان کی ہے، بحیثیت مجموعی مذہب کا ایک جزو رہی ہے۔ جنوبی اور جنوب مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا سیاسی رویہ بعض مخصوص معاشی و سماجی عوامل کے سبب شمالی ہند سے بھی بہت الگ، مسلمانوں اور سید محمد کی زیر قیادت، ایک عرصے تک شمالی ہندوستان کے مسلمانوں سے مختلف رہا، اور اس کی ترجمانی دوسری گول میز کانفرنس کے وقت تک مسٹر محمد علی جناح بھی کرتے رہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، جوں جوں تاریخ کے اہم فیصلے کا وقت قریب آتا گیا مسلمانوں کا یہ "سیکولر" رویہ بھی مذہب کے زیر اثر آ گیا۔ بہرحال اس رویے سے ہوتے ہوئے میں مسلمانوں کو یہ فکر رہی کہ ہندو اکثریت کے مقابلے میں، من حیث الجماعت، ان کا مذہبی وتہذیبی تشخص کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اور آج تقسیم اور مسلمانوں کو ایک "ہوم لینڈ" ملنے کے بعد بھی یہی ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔

آج ہندوستان کے عام مسلمان زندگی کے ایسے کئی "سیکولر" مسائل میں الجھے ہوئے ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہندو احیائیت اور ہندوؤں کی فرقہ پرست جماعتوں کی جارحیت نے جس کا اب کوئی روپ ہیں، ہندی مسلمانوں کے مذہبی اور جماعتی تشخص کے شعور کو صرف بیدار کر دیا ہے بلکہ ان میں یہ جرأت اور حوصلہ بھی پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے اس تشخص کے تحفظ کے لیے ہر قسم کی قربانی دے سکتے ہیں۔

پروفیسر مشیر الحق نے جمہوریہ ہندوستان میں گزشتہ چالیس پچاس برسوں کی مسلم سیاست کی داستان بڑے واقعاتی اور تجزیاتی انداز میں سنائی ہے۔ انھوں نے ان بنیادی مسائل کو جو مسلمانوں کو در پیش رہے ہیں ایسے واقعات کی مثالوں سے سمجھایا ہے جنھوں نے آزادی کے بعد مسلمانوں کے ذہن وشعور کو متاثر کیا ہے۔ ہندوستان میں جمہوری سیکولرزم اور جمہوری ادارے کمزور ہوئے ہیں۔ اس صورت حال نے بھی ایک مذہبی اقلیت کی حیثیت سے انھیں تشویش اور اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے، اور غالباً اسی لیے ان کی سیاست نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی ملک ہو جمہوری سیکولرزم کی کامیابی وناکامی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس سلسلے میں اکثریت کا رویہ کیا ہے!

ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر نگر، نئی دہلی - ۲۵
۱۲ر جون ۱۹۸۹ء

# تعارف

پروفیسر مشیر الحق، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کا خطبہ بعنوان "مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست —— کل اور آج" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے زیر اہتمام سالانہ سرسید یادگاری خطبات کے سلسلے کا تیسرا خطبہ ہے۔

ان یادگاری خطبات کا مقصد یہ ہے کہ سرسید کی علمی، سماجی، تعلیمی، ادبی اور دینی خدمات کو سامنے لایا جائے اور ان کی آج کے ہندوستان میں جو معنویت ہے اس کو سمجھا جائے۔

علی گڑھ کے سابق طلبہ کی تنظیم کا قیام دہلی میں ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ اس کے قیام کے سلسلے میں جناب عزیز امام صاحب، جناب معین الحق صاحب، جناب چودھری طیب صاحب، جناب

سید حامد صاحب، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب، جناب شفیع قریشی صاحب وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس ایسوسی ایشن نے اپنے کام کی ابتدا دو اہم پروگراموں سے کی۔ ایک پروگرام تھا سرکاری ملازمتوں کے لیے مقابلوں کے امتحانات کی تیاری کرانا، اور دوسرا پروگرام دہلی میں ایک اسکول کا قیام تھا —— یہ دونوں پروگرام بڑی کامیابی کے ساتھ مکمل کیے گئے۔ تنظیم کی کوشش سے ۱۹۷۷-۸۰ء کے دوران کافی تعداد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دوسرے مقامات کے طالب علم سرکاری ملازمتوں میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح دوسرے تعلیمی پروگرام کے تحت دہلی میں کریسنٹ اسکول کا قیام عمل میں آیا جو آج بھی [illegible] دہلی میں کامیابی سے چل رہا ہے۔

آگے چل کر اس تنظیم پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب چند برسوں تک یہ کچھ بہت زیادہ فعال اور پر اثر نہیں رہی۔ ۱۹۸۶ء میں اس کے تنظیمی ڈھانچہ میں تبدیلیاں لائی گئیں اور جناب اشتیاق عابدی صاحب کو صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ راقم السطور اور چودھری راحت محمود صاحب کو بالترتیب جنرل سکریٹری اور خازن منتخب کیا گیا۔ نئی کمیٹی نے تعلیمی، ادبی اور ثقافتی پروگرام کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس طرح مسلم پرسنل لا، نئی تعلیمی پالیسی، علامہ شبلی نعمانی وغیرہ موضوعات پر سیمینار منعقد کیے گئے —— ساتھ ہی ساتھ ہر سال، اکتوبر یعنی "یوم سرسید" کے موقع پر عشائیہ اور ثقافتی پروگرام کی داغ بیل ڈالی گئی۔

سرسید یادگاری خطبات کے تحت پہلا خطبہ ۱۹۸۶ء میں پروفیسر علی محمد خسرو، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سابق ممبر پلاننگ کمیشن نے "اقلیتیں اور ہندستانی قومیت" کے موضوع پر، اور دوسرا خطبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مایۂ ناز سابق طالب علم پروفیسر مونس رضا، وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۸۷ء میں "روایتوں میں جدیدیت" کے موضوع پر دیا تھا —— تیسرا خطبہ پروفیسر مشیر الحق صاحب نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو پیش کیا۔

پروفیسر مشیر الحق صاحب نے اپنے معلوماتی اور مدلل خطبہ میں اس تاریخی حقیقت کو



سمجھایا ہے کہ نئی مغربی تہذیب کے نمودار ہونے کے بعد ہندستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں دو مواقع ایسے آئے تھے جب مسلم سیاست کی قیادت نے اپنے کو سیکولر اقدار پر قائم کرنے کی کوشش کی تھی —— پہلا موقع ۱۸۵۷ء میں آیا تھا جب سرسید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کے ذریعہ مسلمانوں کو غیر مذہبی بنیادوں پر سیاسی مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی —— دوسرا موقع ۱۹۴۷ء کے بعد آیا جب مسلمانوں نے یہ طے کیا تھا کہ نئے ہندستان میں مذہب کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں نہ قائم کی جائیں۔ لیکن یہ دونوں تجربے حالات کے دباؤ کی وجہ سے زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئے —— بیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کی سیاسی قیادت مولانا آزاد اور دوسرے علماء کے ہاتھوں میں تھی، ان لوگوں نے مذہبی دلائل کی بنیاد پر مسلمانوں کو سیاسی تربیت دینی شروع کی۔ ابتدا میں یہ قیادت متحدہ ہندستان کی حامی رہی، لیکن آگے چل کر علماء کے ایک طبقہ نے اپنا رشتہ مسلم لیگ سے جوڑ لیا —— جس کا نتیجہ ملک کے بٹوارے کی شکل میں ظاہر ہوا۔

آج پھر مسلم قیادت دوبارہ مذہبی بنیادوں پر سیاسی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بظاہر یہ نتیجہ ہے ملک کی فرقہ وارانہ فضا کا۔ ایسی فضا میں سیکولر قیادت کس حد تک اپنے پیروں پر کھڑی رہ سکتی ہے، ایک غور کرنے کی بات ہے۔

پروفیسر مشیر الحق صاحب کی ابتدائی اور اعلا تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور کناڈا کی مکگل یونیورسٹی میں ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مطالعات اسلامی کے پروفیسر اور سردست کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں —— ان کی صلاحیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال کی ہندستانی مسلم سیاست کا تجزیہ جس علمی انداز سے انھوں نے اپنے اس

خطبے میں پیش کیا ہے وہ محقّقین اور تاریخ کے طالب علموں کے لیے ایک بیش قیمت ذخیرہ ثابت ہوگی۔

مکتبہ جامعہ نے اس کو چھاپ کر اپنی علمی خدمات کا ایک اور ثبوت پیش کیا ہے۔

خواجہ محمد شاہد
جنرل سکریٹری
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
دہلی



ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں مذہب کے رول کا اندازہ کرنے کی غرض سے اس مضمون میں ہندستانی مسلم قیادت کی ماہیت اور خصوصیات کے مطالعے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں چونکہ اس بات کا علم ضروری ہے کہ اس صدی میں آزادی کی جد و جہد کے دوران مسلمانوں کو کس قسم کی قیادت حاصل تھی، اس لیے یہ مقالہ اگر ایک طرف ماضی قریب اور حال کے واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے تو دوسری جانب آئندہ پیش آنے والے حالات کی کسی حد تک نشاندہی بھی کرتا ہے۔

اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ غدر سے قبل برطانیہ کے سیاسی اور سماجی اثرات کو قبول کر لینے والے دوسرے علاقوں کی طرح دہلی اور اس کے اطراف کے مسلمان بھی نئی زندگی سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے تھے، دہلی میں انگریزوں کے قائم کردہ دہلی کالج میں مسلمان طالب علم بھی تھے اور استاد بھی۔ بعض لوگوں نے مغربی علوم و فنون اور سائنس کو اردو میں منتقل کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ بھی نظر آتا ہے کہ علما، جن پر اکثر و بیشتر مسلمانوں اور جدید طرز زندگی کے درمیان حدِ فاصل بن جانے کا آج الزام لگایا جاتا ہے فی الحقیقت شروع میں نہ تو انگریزوں سے وحشت کھاتے تھے اور نہ انگریزی چیزوں سے، اس زمانے کے فتووں، یادداشتوں، سوانح عمریوں اور سرگزشتوں کا بے لاگ مطالعہ ہر شخص کو یہ باور کرا دے گا کہ علمانے ان محرکات کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود جو ان کی فہم و فراست کے مطابق لامذہبیت کی طرف لے جا سکتے تھے۔ مذہب اور لامذہب کے درمیان حد بندی کی ایک لائن کھینچ رکھی تھی، ان دو باتوں کے مابین توازن و اعتدال قائم رکھتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کو فرنگی پڑھ جانے پر انگریزی پڑھنے، مغربی لباس پہننے اور عیسائیوں کے ساتھ سماجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن ان اقدامات کا غدر کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا اور غدر کے بعد حالات نے جو رخ اختیار کیا اس کے پیش نظر مذکورہ بالا خطوط پر پیش رفت کرنے والوں کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

حقیقتاً غدر نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اتنی بڑی خلیج حائل کر دی تھی کہ لوگ دونوں کو قریب لانے کی بات کا بمشکل ہی اظہار کر سکتے تھے پھر



بھی یہ صورت حال زیادہ دنوں تک باقی نہ رہی۔ وقتاً فوقتاً لوگوں نے حالات پر نظر ثانی کرنے اور حاکم فرنگیوں اور محکوم مسلمانوں کے درمیان خوشگوار روابط کو زندہ کرنے کی مخلصانہ کوشش شروع کر دی۔ مثلاً کلکتہ میں ایک خطاب یافتہ مسلمان نواب عبد اللطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی۔ اعلا اور خوشحال متوسط طبقے کے مسلمانوں پر مشتمل اس سوسائٹی کی غرض و غایت بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی اور مذہبی مسائل پر غور و فکر کرنا تھا۔ سوسائٹی کے علمانے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی تھی کہ وہ مسلمانوں کے ذہنوں سے اس غلط فہمی کو نکال پھینکیں گے کہ انگریز اُن کے مذہب کو مٹانے کے درپے ہیں، فی الحقیقت یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا، اس لیے کہ مسلم عوام بالخصوص بنگال اور بہار کے مسلمان فرائضی اور نام نہاد وہابی تحریک کے گہرے اثرات کے تحت مذہبی بنیادوں پر نہ صرف انگریزوں کے دشمن تھے بلکہ ہر وقت ان کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کرتے رہتے تھے چونکہ محمڈن لٹریری سوسائٹی کو اس رجحان کے خلاف لڑنا تھا لہٰذا اس کے ممتاز علمانے اپنی تقریروں اور فتووں کے ذریعہ برملا کہنا شروع کیا کہ ہندوستان کے حالات جہاد کے متقاضی نہیں ہیں۔

دلّی کی صورت حال کلکتہ سے مختلف تھی۔ دہلی نے غدر کے دوران اپنے آپ کو باغیانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ ثابت کر دیا تھا یہاں کے مسلم عوام خصوصاً غدر کے تلخ نتائج کو بھگت رہے تھے اور مسلمان اور انگریز دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ شدید نفرت اور عداوت کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں کسی کا پیش رفت کرکے اس جمود و تعطل کی فضا کا استیصال کرنا ضروری تھا۔ سر سید نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔

سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) نے زندگی کے ہر میدان میں

خواہ وہ سماجی رہا ہو یا سیاسی، معاشی رہا ہو یا مذہبی، مسلم معاشرے کی از سرِ نو قوت آفرینی کے پروگرام کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کے لیے مسلمانوں کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس علاقے کے علما کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عیسائی مبلغین برطانوی حکومت کی مدد سے ان کے مذہب کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اپنے طرزِ زندگی میں تبدیلیوں کے اندیشہ سے علما نے مذہبی تعلیم کا سہارا لیا اور اس مقصد کی خاطر انھوں نے حکومت کے مالی اور انتظامی تعاون سے آزاد ہو کر مدرسوں کو قائم کرنا شروع کر دیا۔

ان مدرسوں کے قیام کا اولین مقصد مسلمانوں کے تعلیمی اور تہذیبی ورثہ کو برقرار رکھنا تھا جس کی تباہی و بربادی فرنگی دورِ حکومت میں عین ممکن نظر آ رہی تھی۔ ان مدرسوں کے بارے میں یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل تک ان مدرسوں کے فارغین نے مسلمانوں کے روایتی طور و طریق کو برقرار رکھنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

سرسید کی نظر مستقبل پر تھی، انھوں نے ماضی کے دھندلکوں میں رہنا پسند نہیں کیا، ان کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان زندگی کے حقائق کو سمجھیں اور پھر انھیں بحسن و خوبی اختیار کریں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے مختلف جہتوں سے الگ الگ مرحلوں میں اپنی مہم کا آغاز کیا۔ پہلا مرحلہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کا تھا یہ غدر اور ۱۸۶۹ء میں ان کے سفرِ برطانیہ کا درمیانی عرصہ تھا، اس زمانے میں انھوں نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" نامی کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ برطانیہ کے وفادار مسلمانوں کے حالات پر مشتمل کتابچوں کا ایک سلسلہ شائع کرنا شروع کیا تاکہ وہ حکمراں طبقے کو اس بات کا یقین دلا سکیں کہ غدر جیسے باغیانہ فعل میں مسلمانوں کا ہاتھ یا تو بالکل نہیں یا بہت ہی معمولی تھا۔ دریں اثنا



جن جن جگہوں پر انھیں سرکاری ملازم کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا وہاں انھوں نے نئے نئے اسکولوں کی داغ بیل ڈالی۔ ان اسکولوں کے طلبا اور عام اردو دانوں کے استفادہ کے پیشِ نظر انھوں نے مغربی ادب اور سائنس پر مشتمل کتابوں کے ترجمے کے لیے ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی بھی قائم کی۔

دوسرے مرحلہ پر سرسید نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی ذمہ داری اٹھائی اور دونوں مذہبوں کے درمیان رشتۂ اتصال کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے بائبل کی ایک تشریح شائع کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے مقالات میں عیسائیوں کے ساتھ سماجی تعلقات قائم کرنے پر زور دیا۔

اس کے بعد ہی انھوں نے انگلستان کا بحری سفر کیا جہاں کی تہذیب اور جدید تعلیم سے متاثر ہو کر انھوں نے لکھا کہ۔۔۔ "ہندوستانی باشندے خواہ وہ ادنا ہوں یا اعلا، سرمایہ دار ہوں یا معمولی دکاندار، عالم ہوں یا جاہل، علم و اخلاق اور ایمانداری میں انگریزوں کے بالمقابل یوں نظر آتے ہیں جیسے لائق اور خوبصورت انسانوں کے بالمقابل گندے جانور۔۔" اپنے خیالات کی تشہیر کے لیے اسی زمانے میں انھوں نے اپنا اردو رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، اس رسالے نے جلد ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا اور سرسید کے ارد گرد ایسے باصلاحیت افراد اکٹھا ہونے لگے جو سماجی اور سیاسی مسائل پر انھیں جیسے خیالات رکھنے کے باوجود اس وقت تک ایک طرح سے بے راہبر تھے — اپنی کامیابیوں سے حوصلہ پا کر سرسید نے اپنے اس خیال کی تبلیغ شروع کر دی کہ مسلمانوں کا ایک ایسا کالج ہونا چاہیے جہاں اسلام کی اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور یورپی زبانیں پڑھائی جا سکیں۔

## ۲

علما اور سر سید ابتدا سے ہی دو مختلف راستوں پر چل رہے تھے۔ علما جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مذہبی روایات سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ نتیجتاً وہ عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کی تعلیمی میراث کو برقرار رکھنے نیز اس کو ترقی دینے کے زیادہ خواہاں تھے۔ ازمنہ وسطیٰ سے اپنی اس گرویدگی کے سبب انھوں نے فطری طور پر "جدت مخالف" یا بظاہر "برطانیہ مخالف" رویّہ اپنا رکھا تھا۔ دوسری طرف سر سید کے نزدیک جدید قدروں بلکہ حقیقتاً برطانوی قدروں کو دل و جان سے اختیار کر لینا ترقی کے لیے ضروری تھا۔ مختصراً ان دونوں گروہوں کے درمیان سب سے بڑا اختلاف جس بات پر تھا اسے آج ہم "ماڈرنزم" کہہ سکتے ہیں۔ علما کی نظروں میں "ماڈرن" ہونے کا مطلب تقریباً ارتداد تھا جبکہ علی گڑھ تحریک کے نزدیک وہ اسلام ہی نہیں ہو سکتا تھا جس کی تشریح و تفسیر جدید انداز اور نئے اسلوب میں نہ کی جا سکے۔ مذہبی مسائل پر سر سید کی تحریریں اور ان کے مخالفین کی تنقیدیں ان دونوں رجحانات کی بیّن مثالیں ہیں۔

کسی ملک میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کا زوال تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں، تنزل و انحطاط کی ایسی مثالیں بے شمار ہیں، لیکن ہندستان میں مسلم دورِ حکومت کے اختتام کی بنیادی اہمیت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے اور اسلامی تاریخ میں اس کی شاید کوئی نظیر بھی نہ مل سکے گی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان اپنے سابقہ محکومین کو نہ صرف اپنے مساوی بلکہ مدمقابل کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد مواقع روزگار کے جو بھی محدود امکانات تھے ان میں انھیں اپنی بقا کے لیے ہندوؤں سے دوش بدوش جدوجہد کرنا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کوئی ایجنسی نہیں رہ گیا تھا جو مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی نگہداشت کرتا نہ ہی ایسا کوئی



ادارہ بچا تھا جو اسلام کو اندرونی شکست و ریخت اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھتا۔ اب تک ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اسلام پر ایسا وقت نہیں آیا تھا جب اسے اپنی حیثیت کا دفاع کرنا پڑا ہو، لوگوں کو اس کی آزادی حاصل تھی کہ یا تو وہ اس کی فوقیت کو تسلیم کر لیں یا پھر اس سے بے تعلق رہیں لیکن کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ علی الاعلان کہتا پھرے کہ وہ اسلام کو رسمی طور پر قبول کیے بغیر بہتر زندگی گزار رہا ہے یا گزار سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں اور خاص طور سے ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی مناظروں کی ایک ہوا چل پڑی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مناظروں کا بنیادی مقصد ایک دوسرے کو سمجھنے سے زیادہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا تھا۔

دونوں گروہوں کے مذہبی لیڈروں نے عوامی سطح پر جب مذہبی تنازعات کو حل کرنے کی کوشش کی تو اس چیز نے پہلے ہی سے بگڑتے روابط کو اور بھی خراب کر دیا۔ یہ مناظرے مسلمانوں کے ذہنوں میں دو طرح کے خیالات پیدا کر رہے تھے۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندو ان پر سیاسی اور معاشی غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہندوؤں کی ان کوششوں کے پس پردہ انگریزوں کا ہاتھ ہے۔ اس طرح وہ ہندوؤں اور انگریزوں دونوں سے بدگمان ہو گئے۔

## ۳

علی گڑھ سیکولر مکتب فکر کو ہندو مذہب پر اسلام کی برتری ثابت کرنے سے کہیں زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ سر سید کی زیر قیادت یہ گروپ "طبقۂ شرفا" سے تعلق رکھنے والے ان مسلمانوں پر مشتمل تھا جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں مسلم دورِ حکومت کے باقاعدہ خاتمے سے بہت پہلے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اس دور کا اختتام قریب آ پہنچا ہے جس

میں مغلیہ حکومت ایک نمایاں رول ادا کر رہی تھی۔ مثلاً سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) نذیر احمد (۱۸۳۱ء-۱۹۱۲ء) ذکاء اللہ (۱۸۳۲ء-۱۹۱۰ء) ——— محسن الملک (۱۸۳۷ء-۱۹۰۷ء) الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) اور علی گڑھ برادری سے تعلق رکھنے والے دیگر سربرآوردہ حضرات نے غدر سے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ جلد یا بدیر برطانوی حکومت مغلوں کی جگہ لینے والی ہے۔ غدر کے دوران ان لوگوں کی عمریں کچھ زیادہ نہیں تھیں اور یہ سب کے سب ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت میں کسی نہ کسی طرح مشغول تھے۔ مثلاً سر سید احمد خاں منصف تھے ——— محسن الملک شعبۂ مالیات میں کلرک تھے، حالی لاہور میں انگریزوں کے قائم کردہ حکومت پنجاب کے بک ڈپو میں مترجم تھے، اور نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس تھے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مذکورہ شخصیتوں میں شاید ہی کسی کو جدید تعلیم حاصل کرنے کا بھرپور موقع ملا ہو۔ تقریباً سبھی کی تعلیم و تربیت عہد وسطیٰ کے تعلیمی نظام میں مکمل ہوئی تھی۔ مغربی خیالات سے ان کی واقفیت ثانوی ذرائع کی رہین منت تھی ——— یا تو مغربی کتابوں کے اردو ترجموں کے ذریعہ یا پھر اپنے انگریز دوستوں کے ذریعہ جو برطانوی دفاتر میں ملازم تھے۔ لیکن یہی لوگ مسلمانوں میں مغربی قدروں کے واحد ترجمان تھے۔ نتیجتاً ان لوگوں نے جب اپنے قدیم سرمایے کی چھان بین شروع کی تو اعتدال و توازن کی روش قائم نہ رکھ سکے۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد، جن کا شمار اساطین اردو میں کیا جاتا ہے، اپنے ادبی سرمایے سے نہ صرف یہ کہ غیر مطمئن تھے بلکہ مغربی ادب کے مقابلہ میں اسے گھٹیا سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ان کا ادب "غلط بیانی اور خوشامد" کا پٹارا تھا۔ اگرچہ وہ بقول خود بڑھاپے میں میاں مٹھو کی طرح انگریزی کے چند الفاظ بولنے لگے تھے لیکن حقیقتاً مشرقی ادب کے مطالعہ نے ان کی ذہنی بالیدگی کو جو نقصان پہنچایا تھا اس کا مداوا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح حالی کی آنکھیں بھی انگریزی ادب کی چمک دمک سے خیرہ ہو چکی تھیں، اور خود ان کے کہنے کے مطابق انگریزی ادب



کی محبت نے آہستہ آہستہ ان کے دل سے مشرقی خصوصاً فارسی ادب کی محبت کو نکال پھینکا تھا۔

بہرحال مشرق و مغرب کے پُر پیچ مسائل کا ناقص علم رکھنے کے باوجود علی گڑھ مکتب فکر نے ہی خلا کو کسی حد تک پُر کیا اور مسلم طبقے کا ترجمان بن گیا۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر اس گروپ کو حکمراں طبقے پر مکمل بھروسا کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مسلمان حکومت کے دست راست بن جائیں اور زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر ملازمتیں حاصل کریں۔ اردو کے مشہور طنز نگار شاعر اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء) نے جنھیں ان کے ہمعصروں نے "لسان العصر" کا خطاب دیا تھا اس صورت حال کی تصویر کشی اپنے خاص انداز میں کی ہے:

انگریز خوش ہے مالک ایڈوانس ہے
ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول کا پول اور خدا کا نام
بسکٹ کا صرف چورہے لیمنڈ کا چھین ہے

بسکٹ کا چورا اور لیمنڈ کا چھین بھی صرف اسی وقت تک مل سکتا تھا جب تک حکومت خوش رہتی۔ اس لیے کسی حالت میں بھی یہ لوگ برطانوی حکومت کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آج ہمیں سننے میں یہ بات بھلے ہی اچھی نہ معلوم ہو کہ علی گڑھ کی قیادت نے برطانیہ کے ساتھ تعلقات و روابط قائم کرنے میں کچھ زیادہ ہی فراخ دلی کا ثبوت دیا لیکن اگر ہم اس وقت کے عام حالات کے پس منظر میں اس واقعہ کا تجزیہ کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ان کے موقف میں بہت حد تک معقولیت تھی۔ یہ حقیقت تقریباً تسلیم شدہ ہے کہ غدر میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مساوی حصہ لیا تھا لیکن بغاوت کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے خاص طور سے مسلمانوں کو اس

تحریک کے بھڑکانے کا ذمہ دار قرار دیا اور انھیں اپنے انتقام کا مخصوص نشانہ بنایا۔ صرف افراد کو سزائیں نہیں دی گئیں بلکہ مسلمانوں پر بہ حیثیت مجموعی سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ انگریزوں کے اس امتیازی رویے کو ہندوؤں نے بالعموم سراہا لیکن جب مختلف اسباب کے پیش نظر حکومت نے اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کی اور مسلمانوں کے ساتھ مصالحانہ حکمتِ عملی اختیار کی تو ہندوؤں کے ایک طبقے نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور ان کے اخبارات نے "ناقابلِ تسخیر کو مسخر کرنے کی غیر عاقلانہ کوششوں پر لمبے چوڑے مضامین شائع کیے"۔ مثلاً ۱۸۷۰ء میں کلکتہ سے نکلنے والے ایک اخبار "ہندو پیٹریاٹ" HINDU PATRIOT نے حکومت سے اس بات کی اپیل کی کہ وہ مسلم نواز پالیسی سے باز آ جائے، کیونکہ تمام مسلمان غدار اور انگریزوں کے دشمن ہیں۔

۴

اس جائزے سے بہر حال ایک بنیادی اور واضح نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس وقت تک نہ تو علی گڑھ اسکول کی سیکولر قیادت کو اور نہ ہی علما کی مذہبی سیادت کو کُل ہند پیمانے پر سربراہی کا درجہ حاصل تھا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے بارے میں جہاں تک علما کا رویہ تھا تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بنگال میں ان کا ایک گروپ کھل کر مسلمانوں کو انگریزوں سے قریب لانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ علی گڑھ کی "آل انڈیا" حیثیت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم ہندستان کے جنوبی اور مغربی حصوں کی سیاسی اور سماجی صورت حال پر نظر ڈالتے ہیں۔

جنوبی اور مغربی ہندستان کے مسلم طبقوں کی معاشی اور سماجی بنیادیں شمالی ہند کے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی بنیادوں سے قطعی طور پر مختلف تھیں۔ شمال، مسلم



حکومت کا گڑھ رہ چکا تھا لہٰذا یہاں جاگیردارانہ نظام کو فروغ حاصل تھا۔ اس کے برخلاف ملک کے جنوبی اور مغربی خطے کے لوگ اپنی بقا کے لیے حکمراں طبقے پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ اس چیز نے ہندستان کے دونوں حصوں کے مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں خاصا فرق پیدا کر دیا تھا۔ چونکہ بمبئی اور مدراس کے مسلمانوں کو اپنی روٹی روزی کے لیے حاکموں پر بہت زیادہ بھروسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے مغلیہ سلطنت کے زوال کا بھی ان پر بہت کم اثر پڑا۔ یہاں کا سرمایہ دار طبقہ پیشہ ورانہ اور تاجرانہ حلقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مزید برآں تعلیمی لحاظ سے بھی یہ لوگ شمال کے مسلمانوں کے بالمقابل زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ اس لیے فطری طور پر شمالی ہند کے مسلمان اور جنوب مشرق سمیت مغرب کے مسلمان معاش پر مبنی سیاسی مسائل کو ایک ہی عینک سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کے برخلاف جنوب مشرق اور مغرب کے ممتاز مسلمان کانگریس میں شمولیت کو نقصان دہ نہیں تصور کرتے تھے۔ غالباً اسی لیے کانگریس کے تیسرے سالانہ جلسے میں اپنے صدارتی خطبے کو پیش کرتے ہوئے بدرالدین طیب جی نے اس بات پر حیرت ظاہر کی تھی کہ شمال کے مسلمان اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ مشترکہ فائدے کی خاطر شانہ بشانہ چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں ـــــ حالانکہ بمبئی پریذیڈنسی میں ہم نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔"

یہ ایک قابلِ لحاظ حقیقت ہے کہ گاندھی جی کی کانگریس میں شمولیت سے قبل ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۰ء تک تین مسلمان کانگریس کی صدارت کے عہدے تک پہنچ چکے تھے، لیکن ان میں سے کسی کا بھی تعلق شمال سے نہ تھا۔ پہلے صدر تو بمبئی کے بدرالدین طیب جی تھے (تیسری کانگریس، مدراس ۱۸۸۷ء) دوسرے صدر رحمت اللہ محمد سیانی تھے (۱۲ ویں کانگریس، کلکتہ ۱۸۹۶ء) ان کا تعلق بھی بمبئی سے تھا۔ تیسرے صدر مدراس کے رہنے والے سید محمد تھے (۲۸ ویں کانگریس، کراچی ۱۹۱۳ء) سید محمد کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کانگریس کی تاریخ میں وہ واحد مسلمان تھے جنھیں تین تین امتیازات

حاصل تھے، یعنی وہ ۱۹۰۳ء میں استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین، ۱۹۱۳ء میں پارٹی کے صدر اور ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک اس کے سکریٹری رہ چکے تھے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ جنوب مشرق اور مغرب کے مسلمان اصولی طور پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی جدوجہد کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، وہاں کے مسلمان لیڈروں پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ انھوں نے ہندو دوستی کی خاطر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی طرف سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کے برعکس وہ مسلم مسائل میں کھلم کھلا دلچسپی دکھاتے تھے، مثلاً بدرالدین طیب جی نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی خدمات کے لیے وقف کردیا تھا۔ انھوں نے بمبئی میں "انجمن اسلام" قائم کی جس کی زیر نگرانی چلنے والے اسکولوں، اقامت گاہوں، ورزش گاہوں اور کلبوں کے ذریعہ صرف انھوں نے مسلم طبقے میں جدید تعلیم کو مقبول بنایا بلکہ اور بہت سی دوسری سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا آغاز بھی کیا۔ وہ تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے۔ علاوہ ازیں بمبئی میں اسلام کلب اور اسلام جمنازیم (اب جمخانہ) جیسے جدید ثقافتی مراکز کے قیام کی ذمہ داری بھی طیب جی کے سرجاتی ہے۔ اسی طرح جنوب میں سید محمد اتنے زیادہ باعزت اور باحیثیت تھے کہ جب ۱۹۰۶ء میں شمالی ہند کے مسلمان قائدین لارڈ منٹو کے پاس وفد لے کر جانے لگے تو وہ ان کو نظر انداز نہ کرسکے۔ منتظمین وفد نے ان سے اس وفد میں شمولیت کی درخواست کی، لیکن انھوں نے شرکت کرنے سے اس بنا پر انکار کردیا کہ وفد ان کے اس مشورے کو ماننے پر تیار نہ تھا کہ عرضداشت سے علاحدہ فرقہ وارانہ نمایندگی کے سوال کو ختم کردیا جائے۔[۳]

## ۵

اب غالباً یہ بات صاف ہوچکی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر تک جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، مسلمانوں کی اپنی کوئی مخصوص سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب



ہرگز نہیں ہے کہ ہندستانی مسلمان بہ حیثیت مجموعی سیاست سے بیگانہ تھے کیونکہ اس وقت بھی کچھ مسلمان انڈین نیشنل کانگریس میں تھے اور کچھ سرسید کے سیاسی فلسفے کی اتباع کررہے تھے۔ بہرحال مسلمانوں کی اپنی کوئی باقاعدہ پارٹی نہیں تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں بعض مسلمان لیڈروں نے جن کا سیاسی رجحان سرسید سے مختلف نہ تھا ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کی ایک سیاسی پارٹی ——— آل انڈیا مسلم لیگ ——— بنائی۔

مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے سامنے دو پارٹیاں تھیں جن میں سے کسی ایک کا انتخاب انھیں کرنا تھا۔ پہلی پارٹی تو انڈین نیشنل کانگریس تھی جو مذہبی تفرقے سے بلند ہوکر تمام ہندستانیوں کی نمایندگی کی دعویدار تھی۔ دوسری پارٹی خود آل انڈیا مسلم لیگ تھی جو اس عزم و ارادہ کے ساتھ میدان سیاست میں اتری تھی کہ وہ مسلمانوں کے مخصوص مفادات کی نگہداشت کرے گی۔ اس وقت تک دونوں جماعتوں کی قیادت بلاشرکت غیرے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ علما بہ حیثیت مجموعی سیاست سے کنارہ کش تھے۔ ان حالات میں کلکتے کے افق پر ایک نوجوان ابھرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے علما کو میدان سیاست میں گھسیٹ لاتا ہے۔

یہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے جن کے بارے میں دیوبند کے مشہور عالم شیخ الہند مولانا محمود حسن نے فرمایا تھا کہ ہم (علما) سو رہے تھے، ابوالکلام نے ہم لوگوں کو نیند سے بیدار کیا۔

ہندستانی سیاست کے اسٹیج پر علما کے اس یکایک ظہور نے ملک کی مسلم سیاست میں ایک نیا زاویہ پیدا کردیا۔ اب تک مذہب اور سیاست دونوں اپنا الگ الگ میدان عمل رکھتے تھے۔ لیکن علما کی آمد کے بعد سیاست کو مذہب کا ایک جزو قرار دیا گیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ گزشتہ صدی کے اختتام پر سرسید نے مسلمانوں سے درخواست کی تھی کہ وہ عملی سیاست

سے احتراز کریں لیکن یہ درخواست مذہبی بنیادوں پر نہ تھی۔ ان کی واحد دلیل یہ تھی کہ مسلمان چونکہ تعلیمی میدان میں پیچھے ہیں اس لیے وہ برطانوی حکومت کی مدد کے بغیر سرکاری ملازمتوں میں اپنا مستحق حصہ نہیں پا سکیں گے۔ ان کی اس دلیل میں، اس بات سے قطع نظر کہ صحیح ہے یا غلط، مذہب کا کوئی رول نہیں تھا۔ انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ سیاست میں حصہ لینا مذہبی لحاظ سے ممنوع ہے۔

دوسری طرف جب مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو ہندستانی سیاست کی بازی گاہ میں اترنے کے لیے اکسایا تو اپنے سیاسی خیالات کی پوری عمارت انھوں نے مذہبی بنیادوں پر استوار کی۔ سیاست کا جھنڈا اٹھانے والے علما نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو خوب خوب بھڑکایا۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بات باور کرانے کی کوشش کی کہ مذہبی آزادی سیاسی آزادی سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی امور میں مسلمانوں کی رہنمائی مذہب کے نام پر اس انداز سے کی گئی کہ جس بات کے متعلق بھی انھیں بتا دیا جاتا تھا کہ یہ شریعت کے خلاف ہے تو اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی وہ جرات نہیں کر سکتے تھے۔

یہ رجحان برابر قائم رہا۔ جدوجہد آزادی کے دوران پہلی صف میں براجمان علما کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مذہبی حوالوں کے بغیر بات نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر مسئلہ کا تصفیہ مذہبی بنیادوں پر کرتے تھے۔ علما کے خیال کے مطابق اس وقت کے مسلمانوں سے یہ اُمید کی جاتی تھی کہ وہ مذہبی فرض کے طور پر خلافت تحریک کے مقاصد کی تائید اور ان سے تعاون کریں گے۔ بیرونی سامانوں کا بائیکاٹ ان پر اس لیے لازم تھا کہ ان کے مذہب کا یہی فیصلہ تھا۔ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا بھی ان پر اس لیے ضروری تھا کہ خدا نے انھیں اس کا حکم دیا تھا۔

ایک مرتبہ جب مسلمانوں کی تربیت اس انداز سے کر دی گئی کہ وہ سیاست کو مذہب کی عینک سے دیکھا کریں تو ان سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ مذہبی



دلائل کے علاوہ وہ کسی اور بات پر دھیان دھریں گے۔ جب تک علما بحیثیت مجموعی قوم پرست رہے اس وقت تک مسلم عوام کو اپنے ساتھ لے کر قومی سیاست کی ڈگر پر چلتے رہنا ان کے لیے آسان تھا لیکن جب ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہو جانے کے بعد مسلم لیگ نے بعض اہم علما پر دسترس حاصل کر لی تو یہ صورت حال جاتی رہی۔ لیگی علما جمعیۃ العلماء اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور نیشنلسٹ علما کے ہر اقدام کی مذہبی بنیادوں پر مخالفت کرنے لگے۔ مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کے اس فیصلے کو ہر شخص غیر منطقی کہے گا جس کے تحت انھوں نے مطالبہ پاکستان کی حمایت کی تھی لیکن گزشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں اس پر حیرت و استعجاب کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ سب سے پہلے نیشنلسٹ علما نے قرآن و حدیث کی بنیاد پر اپنے سیاسی موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ وقت آنے پر لیگی علما نے مطالبہ پاکستان کی تائید میں انھیں ماخذ و حوالہ جات کا سہارا لیا اور اپنے فعل کو اسلامی عمل قرار دینے کی پوری کوشش کی۔ اس موقف کے علاوہ ہر اقدام ان کے نزدیک غیر اسلامی تھا۔ پاکستان رُوئے زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی جانب پہلا قدم تھا اس لیے اس بات پر زور دیا گیا کہ الکشن میں اگر مسلم لیگ کو شکست ہوئی تو ایک صالح اور صحت مند اصول ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔

ہندستانی مسلمانوں سے قوم پرست علما مذہب کی راہ میں قربانی کا مستقل طور پر مطالبہ کرتے رہے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۰ء میں ہزاروں مسلمان اپنی مساجد و مقابر کو غیر مسلموں کے حوالے کر کے علما کی اس یقین دہانی پر ملک سے ہجرت کر گئے تھے کہ ایسا کرنا ان کی مذہبی ذمہ داری تھی۔ تحریک عدم موالات کے دوران مسلم وکلا اور تجار نے اپنا پیشہ ترک کر کے اور بیرونی سامان کا بائیکاٹ کر کے غربت و افلاس کو صرف اس ذریعے گلے لگایا تھا کہ ان کے سامنے ترک موالات کی منطق کو مذہبی پلیٹ فارم سے پیش کیا گیا تھا۔ اگر اس وقت کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو مسلمانوں کو اُن کی مذہبی ذمہ داریوں کی

ادائیگی سے روک سکتی تو تقسیم کے وقت کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ اقلیتی صوبے کے مسلمان اپنی قربانی دینے سے باز رہ جائیں گے۔ یہ بہرحال مذہبی سیاست کی ایک شاندار فتح تھی ——— ملک تقسیم ہو گیا اور ہندستان میں بود و باش کو ترجیح دینے والے مسلمانوں کے سامنے نئے نئے مسائل آ کھڑے ہوئے۔

## ۶

جمہوریۂ ہند میں مسلمانوں کو ایک لازمی مگر غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ آل انڈیا مسلم لیگ جو اب تک مسلم مفادات کی واحد ترجمان ہونے پر مصر تھی میدان سے یکایک غائب ہو گئی۔ نام نہاد سیکولر ذہن رکھنے والے مسلم رہنما یا تو مسلمانوں کو اپنی حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین کر کے پاکستان پرواز کر گئے یا پھر اپنے گزشتہ اعمال کی تلافی اس بات کے اظہار کے ذریعہ کرنے لگے کہ وہ وفاداروں سے بڑھ کر وفادار اور مخلص ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ تقسیم ملک کے ساتھ ہی خونریزی، قتل و غارت گری اور بڑے پیمانے پر ہجرت کا سلسلہ چل نکلا۔ اس طرح مسلم سیاست کچھ عرصہ کے لیے معطل ہو کر رہ گئی۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے بچے کھچے مسلم قائدین کا ایک کنونشن لکھنؤ میں منعقد کیا۔ اس کنونشن میں یہ طے کیا گیا کہ مسلمان اب علاحدہ مسلم سیاسی جماعتیں نہیں بنائیں گے۔ درحقیقت یہ فیصلہ ان کی اس دیرینہ روش سے انحراف کے مترادف تھا جس کے مطابق ان کی سیاسی تربیت ہوئی تھی۔ لیکن حالات کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ علما بھی جن کے نزدیک سیاست اور مذہب میں چولی دامن کا ساتھ تھا، سیاست کو مذہب کی حدود سے باہر رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کہ جمعیۃ العلماء ہند نے بھی جو اس وقت تک مذہب پسند قوم پرور مسلمانوں کا سیاسی پلیٹ فارم تھی، مستقبل میں صرف مذہبی اور سماجی مقاصد کے لیے جد و جہد



کرنے کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ جمعیۃ نے غیر رسمی طور پر انڈین نیشنل کانگریس کی ردیف بنے رہنے کے باوجود اپنے ممبروں کو یہ آزادی دے دی کہ وہ انفرادی طور پر اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں کے بھی ممبر بن سکتے ہیں۔ اس غیر معمولی تبدیلی کی ایک وجہ شاید یہ بھی کہ جمعیۃ کو اعتماد تھا کہ حکومت اور کانگریس پارٹی میں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی موجودگی کی وجہ سے نئے ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ سوتیلے پن کا برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ شاید اسی اعتماد کی وجہ سے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا گیا کہ خود کانگریس میں کوئی ایسی لابی یا پریشر گروپ بنایا جائے جو بوقت ضرورت مسلمانوں کے مسائل کو حل کرانے یا موثر رول ادا کر سکے ——— بہرحال حالات اور رویہ کی تبدیلی کے باعث یہ عین ممکن تھا کہ مسلمان غیر مذہبی سیاست کو اپنا لیتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قیادت کے علاوہ خود اس وقت کی ہندوستانی سیکولر قیادت کے ذہن میں بھی سیکولر اور سیکولرزم کا مطلب واضح نہیں تھا۔ برسہا برس تک تو اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ ہندستان کے تناظر میں سیکولر اور سیکولرزم کا مفہوم کیا ہے۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ اس طرح خود "سیکولر سیاست" ایک بے معنی لفظ بن کر رہ گئی۔ لیکن اس دوران مسلم مخالف قوتیں اپنے کام میں برابر مشغول رہیں اور مسلمانوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اگر وہ اپنے مذہبی اور ثقافتی امتیازات کو باقی دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر انھیں خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنی چاہیے ——— علاوہ ازیں فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم طبقہ کے ساتھ انتظامیہ کے سوتیلے پن نے ان لوگوں کے لیے راہیں پھر سے ہموار کر دیں جو اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کی خاطر آواز بلند کرنے کو اپنی مذہبی ذمہ داری خیال کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ علما نے بھی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ آزادیٔ وطن کے لیے اپنی قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کو اپنے ہی ملک میں مذہبی انداز سے زندگی گزارنے کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس طرح وہ علی الاعلان مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کی زبان میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ برطانوی راج سے نجات پانے کے لیے مسلمانوں کا جوش و خروش مدھم پڑ جاتا، اگر انھیں پہلے

ہے یہ معلوم ہو جاتا کہ آزادی کے بعد اسلامی عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کی ان کی فطری اور آئینی خواہش کو پروان چڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔[۱۱]

رفتہ رفتہ حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ فیصلۂ لکھنؤ پر نظر ثانی کریں اور مستقبل کے لیے سیاسی پروگرام طے کریں۔ یوں ۱۹۶۳ء میں مختلف سیاسی اور غیر سیاسی رجحانات رکھنے والے مسلم قائدین اس وقت کے علیل اور آزردہ دل قدیم کانگریسی رہنما ڈاکٹر سید محمود کی دعوت پر جمع ہوئے باہم غور و فکر کے بعد یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں کے مسائل کو حل کرانے کے لیے چوں کہ کانگریس پر مزید بھروسا نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ان غیر کانگریسی سیاسی جماعتوں اور قائدین سے رابطہ قائم کیا جائے جو مسلمانوں کی مدد کرنے کا وعدہ کریں۔ اس طرح ۱۹۶۳ء میں مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، جس میں جماعت اسلامی نے بھی، جو اب تک عملی سیاست سے کنارہ کش رہا کرتی تھی، حصہ لیا۔ اگرچہ اپنے منشور کے مطابق مشاورت کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی لیکن سیاست سے بہر حال اس کا گہرا تعلق تھا۔ اس نے حق رائے دہندگی کے سلسلے میں مسلمانوں کو ایک منفی طریق کار اپناتے ہوئے مثبت رہنمائی بہم پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اس سے قبل مسلمان بہ حیثیت جماعت بالعموم اپنے ووٹ کانگریس کے حق میں ڈالتے تھے لیکن ۱۹۶۷ء کے الکشن میں مشاورت نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ووٹ کانگریسی امیدواروں کے بجائے ان غیر کانگریسی امیدواروں کے حق میں ڈالیں جو ان کے مقاصد کے سلسلے میں ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ان کی مدد کرنے کا وعدہ کریں۔ یہ ایک بالکل ہی نیا تجربہ تھا۔ مشاورت کے تعاون سے اچھے خاصے غیر کانگریسی امیدوار کامیاب ہوئے۔ لیکن وقت پڑنے پر ان لوگوں نے جن پر مشاورت اپنا حق سمجھتی تھی عملاً یہ جتا دیا کہ وہ اپنی ذات یا اپنی پارٹی کے سوا کسی دوسرے کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔

حالات ایسے حوصلہ شکن ثابت ہوئے کہ مشاورت کے ایک گروپ نے



مسلم مفاد کی نگہداشت کی خاطر ایک علاحدہ باقاعدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کی بابت سوچنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی مرحوم کی قیادت میں مشاورت کے وہ تمام لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے جو مشاورت کے جامد اور انفعالی طریق کار سے مطمئن نہیں تھے، اس طرح ڈاکٹر فریدی کی قیادت میں اتر پردیش میں مسلم مجلس کی بنیاد پڑی، اور ۱۹۶۹ء میں جب اتر پردیش میں ریاستی اسمبلی کے لیے الکشن ہوا تو مسلم مجلس نے باقاعدہ اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ الکشن کے نتائج غیر معمولی طور پر مجلس کے حق میں رہے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ جلد ہی مسلم مجلس ایک ایسی سیاسی قوت بن جائے گی جسے نظر انداز کرنا آسان نہ ہوگا لیکن مجلس ایک شعلۂ مستعجل کی طرح چمکی بھی اور بجھی بھی۔ اگرچہ نام کے لیے اس کا وجود آج بھی باقی ہے لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

بہر حال اگر اور کچھ نہیں تو مسلم مجلس مشاورت اور مسلم مجلس کے تجربوں سے مسلمانوں کی ہمت بندھی اور وہ کھل کر اپنی سیاسی جماعت یا جماعتوں کے قیام کی بات کرنے لگے۔ وقتاً فوقتاً کئی ایک جماعتیں قائم بھی ہوئیں۔ مثلاً بہار میں عوامی تنظیم، یا دہلی میں مسلم لیگ اور آدم سینا، لیکن یہ ایسی ہی تھیں کہ بہتوں کو نہ تو ان کے آنے کی خبر ملی اور نہ جانے کا پتا چلا۔ ہاں انڈین یونین مسلم لیگ نے، جو آزادی کے بعد ایک طرح سے کیرالا اور مدراس میں محصور ہو کر رہ گئی تھی، اپنے حصار سے باہر قدم نکالا۔ اس نے شمالی ہند، خصوصاً یو پی کے ان اضلاع میں جہاں مسلمانوں کی معتد بہ آبادی ہے، اپنے اثرات کو پھیلانے کی طرف توجہ کی لیکن اس سلسلے میں ابھی تک اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

حیدر آباد میں تقسیم سے قبل قائم ہونے والی مجلس اتحاد المسلمین کو آزادی کے بعد ایک ایسے سیاسی اچھوت کی حیثیت دے دی گئی تھی جس کی قربت سے بھی لوگ گھبراتے تھے، اور آہستہ آہستہ اس کا نام بھی ذہنوں سے نکلتا جا رہا تھا۔ لیکن

حالات نے پلٹا کھایا اور اس کے موجودہ صدر سلطان صلاح الدین اویسی نے اس میں پھر سے جان ڈالنے کی کوشش کی۔ اگرچہ مجلس اتحاد المسلمین ابھی تک ایک ریاستی جماعت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اپنے حلقۂ اثر میں وہ اپنے وجود کو منواتی جا رہی ہے۔ حیدرآباد اور سکندرآباد کے سابقہ میونسپل الکشن میں مجلس نے جو غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے اسے دیکھتے ہوئے اس علاقہ کے "فضلائے سیاست" کے لیے اب یہ بات آسان نہیں رہ گئی ہے کہ وہ اس کے اثرات اور طاقت کو نظر انداز کرتے رہیں۔

جمعیۃ العلما بھی، جس نے اپنے کو لکھنؤ کنونشن کے بعد ایک غیر سیاسی جماعت میں تبدیل کر لیا تھا، آہستہ آہستہ مجبور ہو گئی کہ اپنے پرانے محور پر لوٹ آئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دوسری ہندستانی سیاسی جماعتوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس جماعت کے بھی دو حصے ہو گئے۔ اصل جمعیۃ العلما کی قیادت پرانے کانگریسی قائد مولانا اسعد مدنی کے ہاتھوں میں رہی اور دوسرے گروہ نے ملی جمعیۃ العلما بنائی جس کی سربراہی مولانا سید احمد ہاشمی نے اپنے سر لی جو مسلمانوں کے معاملے میں کانگریس کی پالیسیوں سے برگشتہ ہو کر کچھ دنوں کے لیے لوک دل (بی) میں چلے گئے تھے لیکن اب پھر کانگریس میں واپس آ چکے ہیں۔

بہرحال ان باتوں کا نتیجہ اور کچھ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو، اتنا تو ہم نے ضرور دیکھا کہ تقسیم کے فوراً بعد ہندستانی رہنماؤں نے جس سیکولر قیادت کا خواب دیکھا تھا وہ پورا نہ ہو سکا، اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نظریں پھر سے مذہبی قیادت کی طرف اٹھنے لگیں۔ اور علما یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ زیادہ دنوں تک مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی مفادات کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ اس لیے ایسی ہر کوشش کا، جس میں مسلمانوں کے تشخص کے ضائع ہونے کا ذرا بھی شبہ پایا جاتا ہو، انھوں نے مقابلہ کرنا شروع کیا۔ اس احساس ذمہ داری کی ایک مثال ہمیں دلّی میں منعقد ہونے والے ۱۹۷۷ء کے ملی کنونشن میں ملتی ہے۔ اس



کنونشن میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مسلمان اپنی مذہبی اور ثقافتی وحدت کا اظہار کرنے اور اپنے حال اور مستقبل کے لیے کوئی مثبت لائحہ عمل طے کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ دوسری تجاویز کے علاوہ کنونشن نے تھنوانی کمیشن کے بارے میں بھی جو بوہرہ طبقے کے "سیدنا" پر اُن کے باغی متبعین کے ذریعہ لگائے گئے مبینہ الزامات کی تحقیقات کر رہا تھا، ایک تجویز پاس کر کے ان لوگوں کے خیالات کی تائید کر دی جو اس قسم کے تحقیقاتی کمیشن کی تقرری کو اقلیتوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ بات یقیناً حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ ایسے وقت میں جب کہ پاکستان احمدیہ فرقے کو دائرۂ اسلام سے خارج کر رہا تھا، ہندستان کے علما بوہروں کو کلیجے سے لگا رہے تھے۔ لیکن مسلم قیادت حالات کے دباؤ کی وجہ سے مجبور تھی کہ وہ چار و ناچار "سیدنا" کی مدافعت کرے۔ بہرحال اس سلسلے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے تاہم اس سے اس بات کا تو پتا چلتا ہے کہ علما مسلمانوں کے سلسلے میں اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔

آج کی مسلم سیاست قطعی طور پر اس سیاست سے مختلف ہے جس کا تصور ملک کی آزادی کے فوراً بعد کیا گیا تھا۔ آج مسلمان لیڈر اور مسلم جماعتیں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی اپنے مطالبات کا اظہار لفظوں کو چبا چبا کر نہیں کرتیں، بلکہ وہ کھلم کھلا اپنے خیال کا اظہار کرتی ہیں اور موقع آ جانے پر ملازمتوں اور پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں کی نمائندگی کا مطالبہ بھی کرتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۸۰ء کے پارلیمانی الکشن کے موقع پر جمعیۃ العلماء ہند نے فوج، پولیس اور دفاعی محکموں میں مسلمانوں کے لیے ۳۰ فی صد جگہیں مخصوص کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح مسلم مجلس مشاورت بھی اس بات کے حق میں تھی کہ پولیس اور انتظامی محکموں میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی ملنی چاہیے۔ امام جامع مسجد، دہلی، مولانا عبداللہ بخاری نے اپنے اس مطالبے کو پوری شد و مد کے ساتھ پیش کیا تھا کہ مسلمانوں کو نہ صرف نظم و نسق قائم کرنے والے اداروں اور پولیس اور مسلح افواج میں کم از کم ۳۰ فی صد ریزرویشن ملنا چاہیے بلکہ اسی حساب سے لوک سبھا اور کابینہ میں بھی انھیں نمائندگی دی جانی چاہیے[۱۵]۔ اس مقصد کے تحت

اس وقت مختلف مسلم جماعتیں ایسے سیاسی گروہوں کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ کرنے کی بات کر رہی تھیں جو اُن کے مطالبات کو پورا کرنے کی ہامی بھر لیتے۔ اس انتخاب میں مختلف سیاسی پہلوانوں نے مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کی خاطر جس طرح علما کا دل جیتنے کی کوششیں کی تھیں وہ بھی ایک قابلِ دید منظر تھا لیکن الکشن کے نتائج نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی کہ مسلم عوام ہر مشکل موقع پر علما کی طرف دیکھنے اور ان کی تعظیم و تکریم کرنے کے باوجود الکشن کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی خود سر واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً ابھی پارلیمانی الکشن میں سیتاپور کے حلقۂ انتخاب سے جنتا کے ٹکٹ پر کہا جاتا ہے کہ مولانا علی میاں کی اخلاقی تائید کے ساتھ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے الکشن لڑا تھا، سہارن پور سے مولانا اسعد مدنی کی تائید سے کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے مولانا عبدالخالق نے مقابلہ کیا تھا اور امروہہ کے حلقۂ انتخاب سے کانگریس ہی کے ٹکٹ پر مولانا عبداللہ بخاری کی حمایت کے سہارے راشد علوی الکشن لڑنے کے لیے میدان میں اُترے تھے۔ لیکن کامیاب ان میں سے کوئی بھی نہ ہو پایا۔ حالانکہ یوپی کے یہ تینوں حلقے ایک طرح سے "مسلم حلقے" سمجھے جاتے ہیں۔

اس تجزیہ کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ مسلم عوام پر علما کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ الکشنی جنگ کے علاوہ ہر نازک موقعے پر عوام اپنی رہبری کے لیے علما ہی کی طرف لپکتے ہیں اور حکومت بھی اپنی مذہب لاتعلقی کا اعلان کرتے رہنے کے باوجود ایسے مواقع پر اپنے ووٹروں کی مذہبی زود حسی کو نظر انداز کر جانے کی ہمت نہیں کر پاتی۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ سپریم کورٹ نے طلاق کے ایک مقدمہ "شاہ بانو بنام محمد احمد" میں یہ فیصلہ سنایا تھا کہ طلاق دینے والے شوہر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی مطلقہ کو صرف دورانِ عدت ہی نہیں، بلکہ تاحیات یا دوسری شادی کر لینے تک نان و نفقہ دیتا رہے۔ یہ فیصلہ اگرچہ رائج قانونِ شریعت کے خلاف تھا لیکن سپریم کورٹ نے قرآن کی ایک آیت کی از خود تشریح کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس کا فیصلہ قانونِ شریعت کے موافق ہے۔ عدالت کے اس



دعوے سے علما متفق نہیں تھے۔ پہلے تو اس موضوع پر اخباری جنگ ہوتی رہی، پھر بات اتنی بڑھی کہ پارلیمنٹ میں مسلم لیگ کے نمائندے جی۔ ایم۔ بنات والا نے باقاعدہ یہ تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹ عدالتی فیصلہ کو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت قرار دیتے ہوئے کالعدم قرار دے دے۔ ابتدائی مرحلہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت جھکنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کی طرف سے اس وقت کے ایک مسلمان وزیر ریاست نے قرآن، حدیث اور فقہی اقوال کی بنیاد پر سپریم کورٹ کے فیصلہ کی بھرپور مدافعت کی۔ لیکن جلد ہی سب کو اندازہ ہو گیا کہ اگر بات قرآن و حدیث کی ہے تو پھر علما کے علی الرغم مسلم عوام کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ پس پردہ کیا کچھ ہوا اسے تو محرمانِ راز ہی بتا سکتے ہیں لیکن دیکھنے میں یہ آیا کہ بنات والا نے اپنا پرائیوٹ ممبر بل واپس لے لیا، اس کی جگہ خود حکومت نے ایک سرکاری بل علما کے مشورہ سے تیار کر کے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جس کی تائید ایک دوسرے مسلمان وزیر ریاست نے اسی قرآن اور حدیث اور فقہی اقوال کی بنیاد پر کی۔ بل پاس ہو گیا اور یہ قانون بن گیا کہ عدت کے بعد نان و نفقہ کی ذمہ داری طلاق دینے والے سابقہ شوہر کے بجائے عورت کے والدین اور دوسرے اعزہ پر ہوگی۔

آج مسلم سیاست کے سامنے صرف مسلم پرسنل لا کے تحفظ ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسے اور بھی کئی ایک ہیجان انگیز مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مثلاً اجودھیا کی بابری مسجد، آثارِ قدیمہ کے تحت محصور "صنادیدی" مساجد میں پابندی سے نماز باجماعت ادا کرنے کا استحقاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی — اور اب اس کے ساتھ ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسلامی اور اقلیتی کردار کی بحالی، یا اس بات کی بے معنی بحث کہ تاج محل، قطب مینار، دہلی کی جامع مسجد اور دوسری ہندی اسلامی تہذیب کی نمایندہ عمارتوں کے بانی دورِ وسطیٰ کے مسلمان بادشاہ اور سلاطین تھے یا یہ عمارتیں اصلاً مندر اور ہندو راجاؤں کے محل تھے۔ یہ فہرست طویل بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارا مقصد یہاں "چھیڑ خوباں" قسم کے مسائل کی لمبی چوڑی فہرست پیش کرنا نہیں ہے۔ ہم اس

بحث میں بھی نہیں پڑنا چاہتے کہ مسلم قیادت ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے مذکورہ بالا قسم کے مسائل پر جس تندہی سے لگی ہوئی ہے وہ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا مضر۔ یہ سوال خود اپنی جگہ بہت اہم اور جواب طلب ہے، لیکن ہمارے موضوع سے براہ راست متعلق نہیں ہے۔ ہم نے ان مسائل کی طرف صرف اس لیے اشارہ کیا تھا کہ دیکھا جا سکے کہ آج کے ہندستانی مسلمان کو کس نوعیت کی قیادت حاصل ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسے تمام مسائل پر جنھیں مسلم قیادت مسلمانوں کے تشخص پر کسی طور پر بھی حملہ سمجھتی ہو، آج کا ہندستانی مسلمان اپنے جذبات کا اظہار انفعالی انداز سے نہیں کرتا۔ وہ اپنے قائدین کے چشم و ابرو کو دیکھتا ہے اور اگر اس سے کہہ دیا جائے تو وہ اپنے اور اپنوں سب کو منزل کی تلاش میں قربان کر دیتا ہے۔ گرفتاریاں دیتا ہے، پولیس کی گولیاں کھاتا ہے، ریلیاں نکالتا ہے، مظاہرے کرتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کچھ کرتا ہے۔ اگر پچیس تیس سال قبل کوئی اس تبدیلی کی پیشین گوئی کرتا تو لوگ اسے دیوانے کا خواب کہتے۔

اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ احتجاجی قیادت جدید تعلیم یافتہ سیکولر اور ماڈرن مسلمانوں کے بجائے عملاً علما کے ہاتھوں میں ہے اور جو چند غیر علما مسلم قائدین اس احتجاجی سیاست کی تماشا گاہ میں نمایاں نظر آتے ہیں وہ بھی علما کی مدد کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔



# حوالہ جات


۱ مثال کے لیے ملاحظہ ہو، ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی کتاب "دی انڈین مسلمانس" کے ضمیمہ نمبر ۳ میں مولوی کرامت علی جونپوری کے ایک لکچر کا خلاصہ۔ (کلکتہ ۱۸۷۱ء)

۲ ڈپٹی نذیر احمد "مسلمانوں کی حیاتِ تعلیمی" بحوالہ رفیق زکریا "رائز آف مسلمس ان انڈین پالیٹکس"۔ (بمبئی ۱۹۷۰ء) ص ۳۲۵۔

۳ مبنی بر ترجمۂ حالی "مشمولہ" مقالاتِ حالی" مرتبہ بابائے اردو مولوی عبدالحق (دہلی ۱۹۳۴ء)

۴ سید محمود، "ہندو مسلم کلچرل ایکارڈ" (بمبئی ۱۹۴۹ء) ص ۱۶۔

۵ بشیر احمد ڈار، "ریلیجس تھاٹ آف سید احمد خاں" (لاہور، ۱۹۰۰ء) ص ۷۶۔

۶ اینڈریوز اور مکھرجی، "دی رائز اینڈ گروتھ آف دی کانگریس ان انڈیا" بحوالہ ڈبلیو۔ سی۔ اسمتھ "ماڈرن اسلام ان انڈیا" (لندن ۱۹۴۶ء) ص ۱۳۔

۷ "کانگریس انسائیکلوپیڈیا" (انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء - ۱۹۲۰ء) مرتبہ: کے۔ ایشور دت (دہلی، نیا ایڈیشن) ص ۴۰

۸ ایضاً ص ۳۴۹

۹ مثال کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا محمد میاں "جمعیۃ کیا ہے؟" جلد ۲ (دہلی ۱۹۴۰ء) ص ۱۵۔ علاوہ ازیں، ابوالکلام آزاد "خطبات آزاد" (دہلی ۱۹۵۹ء) ص ۵۵، "الہلال" جلد ۱ شمارہ ۳ (۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء) نیز مولانا عبدالماجد بدایونی —— "درس خلافت" (پہلی اشاعت ۱۹۲۰ء) پانچویں اشاعت میرٹھ ب، ت، ص ۴۴، مولانا محمود حسن "ترک موالات" (بجنور ۱۹۱۹ء) ص ۳۶

۱۰ مولانا شبیر احمد عثمانی، "پیغام بنام مؤتمر کل ہند جمعیۃ العلماء اسلام" (لاہور ۱۹۴۵ء) ص ۴۳۔

۱۱ مولانا ابوالحسن علی ندوی، "خطبہ صدارت دینی تعلیمی کونسل" مرادآباد اجلاس ۱۴ر جون ۱۹۶۹ء۔

۱۲ ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۲۰ر ستمبر ۱۹۷۹ء، ص ۳۔




# اظہارِ تشکر

شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ برصغیر کی جامعات میں صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ملک کے ہر شہر اور قابل ذکر قصبات میں یہاں کے فارغ التحصیل لوگوں سے آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ علی گڑھ ایک روایت کا نام ہے جس کی اہمیت کا اندازہ ہم یونیورسٹی میں رہنے کے دوران پوری طرح نہیں کر پاتے۔ ہاں جب وہاں سے باہر آجاتے ہیں تب احساس ہوتا ہے کہ اپنی کوتاہیوں کے باعث ہم نے وہ سب کچھ حاصل نہیں کیا جو مادر علمی ہمیں دینے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دراصل اسی احساس کا نام ہے۔

آج علی گڑھ کے بارے میں جتنا کہا اور لکھا جاتا ہے اس کے پیش نظر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شہر شہر اور قصبے قصبے میں اولڈ بوائز کی تنظیمیں کام کر رہی ہوتیں —— لیکن ایسا نہیں ہے۔ تاہم بڑے بڑے شہروں میں اس تنظیم کی شاخیں قائم ہیں —— کہیں قائم اور کہیں فعال۔ ایسوسی ایشن کی دہلی شاخ بفضلہ تعالیٰ پچھلے چند برسوں سے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرتی آ رہی ہے۔ دوسرے منصوبوں کے ساتھ ساتھ دہلی برانچ ہر سال یوم سرسید کے موقع پر یادگاری خطبات کا اہتمام کرتی ہے۔ اس سے پہلے پروفیسر علی محمد خسرو، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پروفیسر مونس رضا، وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی یادگاری خطبات پیش کر چکے ہیں۔ تیسرے خطبے کے لیے قرعہ فال میرے نام نکلا تھا جس کے لیے میں ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر اشتیاق عابدی اور سکریٹری خواجہ محمد شاہد کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ عزیز گرامی شاہ علی خاں صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ خطبہ موجودہ صورت میں آپ تک شاید نہ پہنچ پاتا۔

مشیر الحق ——

وائس چانسلر
کشمیر یونیورسٹی

۲۰ر جون ۱۹۸۹ء

# اظہارِ تشکر

شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ برصغیر کی جامعات میں صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ملک کے ہر شہر اور قابلِ ذکر قصبات میں یہاں کے فارغ التحصیل لوگوں سے آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ علی گڑھ ایک ورثہ کا نام ہے جس کی اہمیت کا اندازہ ہم یونیورسٹی میں رہنے کے دوران پوری طرح نہیں کر پاتے۔ ہاں جب یہاں سے باہر آ جاتے ہیں تب احساس ہوتا ہے کہ اپنی کوتاہیوں کے باعث ہم نے وہ سب کچھ حاصل نہیں کیا جو مادرِ علمی ہمیں دینے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دراصل اسی احساس کا نام ہے۔

آج علی گڑھ کے بارے میں جتنا کہا اور لکھا جاتا ہے اس کے پیشِ نظر ہونا تو چاہیے تھا کہ شہر شہر اور قصبے قصبے میں اولڈ بوائز کی تنظیمیں کام کر رہی ہوتیں ــــــ لیکن ایسا نہیں ہے۔ تاہم بڑے بڑے شہروں میں اس تنظیم کی شاخیں قائم ہیں ــــــ کہیں قائم اور کہیں فعال۔ ایسوسی ایشن کی دہلی شاخ بفضلہ تعالیٰ پچھلے چند برسوں سے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرتی آ رہی ہے۔ دوسرے منصوبوں کے ساتھ ساتھ دہلی برانچ ہر سال یومِ سرسید کے موقع پر یادگاری خطبات کا اہتمام کرتی ہے۔ اس سے پہلے پروفیسر علی محمد خسرو، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پروفیسر مونس رضا، وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی یادگاری خطبات پیش کر چکے ہیں۔ تیسرے خطبے کے لیے قرعۂ فال میرے نام نکلا تھا جس کے لیے میں ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر اشتیاق عابدی اور سکریٹری خواجہ محمد شاہد کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ عزیز گرامی شاہد علی خاں صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ خطبہ موجودہ صورت میں آپ تک شاید نہ پہنچ پاتا۔

مشیر الحق ــــــ

وائس چانسلر
کشمیر یونیورسٹی

۳۰ جون ۱۹۸۹ء